

(Consciousness) کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کے اعمال کی قوت محرکہ اس کی اقتصادی ضروریات ہیں تو انسان کے نصب العینوں کی حیثیت کیا ہے اور ایسا کیوں ہے کہ انسان کے سارے اعمال و افعال اقتصادی ضروریات سے نہیں بلکہ نصب العینوں سے پیدا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کارل مارکس اور اس کا دوست اور فلسفہ سوشلزم کی تخلیق کا شریک کار اینگلس دونوں اس حقیقت کی ایک عجیب و غریب وجہ بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دراصل تو اقتصادی ضروریات ہی انسان کے اعمال کی قوت محرکہ ہیں لیکن انسان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی اقتصادی ضروریات کے لیے نہیں بلکہ کسی نصب العین کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ یہ بات کچھ اس قسم کی ہے کہ ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر چلا جا رہا ہو اور دیکھنے والوں کو ساتھ ساتھ یہ کہتا جائے کہ آپ یقین رکھیں کہ میں اپنے لیے اس گھوڑے پر سوار ہوں۔ آپ کو فقط ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوں۔ سوال یہ ہے کہ اگر جو کچھ محسوس ہوتا ہے حقیقت وہ نہیں تو اس کا کوئی ثبوت بھی تو ہونا چاہیے کہ حقیقت کچھ اور ہے اور نہ جو کچھ محسوس ہوتا ہے اسی کو حقیقت کیوں نہ سمجھا جائے؟ ذاتی احساس سے بڑھ کر کسی چیز کا ثبوت اور کیا ہوگا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب دنیا میں ہر آدمی کا احساس وہی ہو اور اس کلیہ کا استثناء ایک بھی موجود نہ ہو۔ ہر شاہد بھی تو دیکھنے والے کے ذاتی احساس میں بدل کر ہی ایک حقیقت بنتا ہے۔ دراصل یہ بھمارا قسم کا بے بنیاد دعویٰ کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تاریخ کا ہر مذہبی علمی یا اخلاقی انقلاب درحقیقت ایک اقتصادی انقلاب تھا۔

مارکس لکھتا ہے:

”جس طرح سے کوئی شخص ایک فرد کے تعلق اس بنا پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ اُس طرح سے کوئی شخص سماجی انقلاب کے ایک دور کے تعلق اس بنا پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا کہ اس دور کے لوگوں کا شعور (یعنی نصب العین) کیا ہے۔“

اسی طرح سے اینگلس لکھتا ہے:

”نصب العین کی سوچ ایک ایسا عمل ہے جسے نام نہاد سوچنے والا لاریب شعوری طور پر انجام دیتا ہے، لیکن ایک کا ذہن شعور کے ساتھ۔ اُس کے عمل کو حرکت میں

لانے والی اصل قوتیں اس کے لیے نامعلوم رہتی ہیں۔ لہذا وہ عمل کی کاذب اور ظاہری قوتوں کا ہی تصور کرتا ہے۔ چونکہ اُس کا سارا عمل نصب العین کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نصب العین پر مبنی ہے۔

لیکن اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے کہ جو شخص ایک اخلاقی یا مذہبی نصب العین کی جستجو کرتا ہے، اس کا یہ خیال کاذب ہوتا ہے کہ وہ ایسا کر رہا ہے اور درحقیقت وہ اپنی اقتصادی ضروریات کا اہتمام کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ ایک شخص کو دماغی طور پر صحت مند ہونے کے باوجود اپنی اقتصادی ضروریات کسی اخلاقی یا مذہبی نصب العین کے ایسے تقاضے نظر آتے ہیں جن کا اقتصادی ضروریات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ جن کی خاطر وہ اپنی اقتصادی ضروریات کو بلکہ اپنی زندگی کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ جب ایک شخص کو یہ ہو کہ لگتی ہے تو وہ صاف کہتا ہے کہ اُسے خوراک کی ضرورت ہے اور یہ نہیں کہتا کہ اسے مسجد میں جانے کی ضرورت ہے۔ لیکن جب وہ اپنی بھوک کا علاج کرنے کے لیے موجودہ اقتصادی حالات کو بدلنا چاہتا ہے تو وہ صاف طور پر اپنے مقصود کا ذکر کیوں نہیں کرتا اور اس کی بجائے کسی اخلاقی یا مذہبی نصب العین کا ذکر کیوں کرتا ہے اور اس کی عقل پر ایسا پردہ کیوں پڑ جاتا ہے جو اُس کو مجبور دیتا ہے کہ وہ درحقیقت کیا چاہتا ہے۔ وہ اپنی پسندیدہ اقتصادی تبدیلی کو برپا کرنے کے لیے ایک ٹیڑھا اور منافقانہ راستہ اختیار کر کے یہ کیوں کہتا ہے کہ وہ فلاں مذہبی یا اخلاقی نصب العین کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ مارکس اور اینجلز کے خیال کے مطابق انسان فقط ایک اقتصادی وجود ہے اور ایک مذہبی یا اخلاقی وجود نہیں۔ اور اُس کے لیے سیدھا اور غیر منافقانہ راستہ اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ موجود نہیں۔ جب انسان کی ساری خواہشات اقتصادی خواہشات ہیں تو وہ ظاہری طور پر لا شعوری طور پر یا منافقانہ طور پر بھی ایسی غیر حقیقی اور فرضی خواہشات کا بندہ کیوں بن جاتا ہے جو روحانی یا اخلاقی خواہشات کہلاتی ہیں اور جن کے مقابلہ میں وہ اقتصادی خواہشات کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔ اور پھر جب کسی شخص کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے کہ اُس کے عمل کے اصلی محرکات کیا ہیں تو مارکس اور اینجلز کو ان محرکات کا علم کیسے ہو گیا؟ اینجلز تسلیم کرتا ہے کہ انسان کا "سارا عمل نصب العین کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ اس کے باوجود وہ یہ نہیں مانتا کہ یہ عمل نصب العین پر مبنی ہے حالانکہ کسی دلیل کے بغیر اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ وہ نصب العین کے ذریعہ سے اسی

ایک قابل غور بات

یہ بات قابل غور ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہمارے شکلات شعور یا ہمارے نصب العین (خواہ مارکسی انہیں اقتصادی حالات کی پیداوار یا اقتصادی ضروریات کی کاذب اور بگڑی ہوئی شکلیں ہی کہیں) ہمیشہ حسن نیکی اور صداقت کے اوصاف کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ وہ ہر حالت میں ان ہی صفات سے حصہ لیتے ہیں اور جوں جوں اپنے آپ کے متعلق ہمارا علم ترقی کرتا جا رہا ہے وہ ان صفات سے اور قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم اقتصادی ناہمواریوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہوں تو پھر بھی ہم انصاف، انداد، عدل، مساوات، اخوت، آزادی اور جمہوریت ایسے تصورات کا نام لیتے ہیں جو حسن نیکی اور صداقت اور خدا کی دوسری صفات سے ماخوذ ہیں اور حسن کی متنازعہ کی آرزو کا ایک عنصر ہے۔ ان اوصاف کی متنازعہ ہمارے تمام انقلابات کا مشترک پس منظر ہوتی ہے خواہ یہ انقلابات اقتصادی، اخلاقی، علمی اور سیاسی۔ کیا یہ حقیقت اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتی کہ حسن نیکی اور صداقت کی آرزو انسان کے شعور کی ایک مستقل خاصیت ہے جس کی تشفی کے لیے ہم وقتاً فوقتاً اپنے اقتصادی، اخلاقی، علمی اور سیاسی حالات کو بدلنے کے لیے جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔

شکلات شعور میں کارل مارکس نے عقل اور استدلال کو بھی شمار کیا ہے۔ چونکہ عقل بھی اقتصادی حالات کا نتیجہ ہے وہ صداقت کی جستجو کرنے کے لیے آزاد نہیں اور لہذا صداقت کو دریافت نہیں کر سکتی۔ یہ نقطہ نظر سراسر غیر عقلی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی یہ سمجھے کہ وہ گرد و پیش کے اقتصادی حالات سے آزاد ہو کر عقلی استدلال کر رہا ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ وہ ایک وہم میں مبتلا ہے، لیکن اگر صداقت دریافت نہیں کی جاسکتی تو مارکس کے پیرو اپنے فلسفہ کو ایک صداقت کے طور پر کیوں پیش کرتے ہیں۔

مارکس اور اینجلز نے اپنے فلسفہ کی بنیاد عقلی استدلال پر رکھی ہے اور وہ عقلی استدلال ہی سے دوسروں کو قائل کرنا چاہتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اگر انسان کی عقل بھی وہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہے جو روبرو اقتصادی حالات مقرر کریں تو پھر اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہو سکتی اور نہ وہ اس قابل ہی ہو سکتی ہے کہ صداقت کی طرف راہنمائی کرے۔ اگر اشتراکیت کا فلسفہ بھی اقتصادی ضروریات کی ایک مجموعی ہوئی شکل ہے تو پھر نہ وہ عقل پر مبنی ہو سکتا ہے اور نہ درست۔ (جاری ہے)

سورة البقرة

آیت ۶۲

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطع بندی (پیرا گرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شاملاً ہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانے) ہندسہ اس سورۃ کا قطع نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (میں) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغة، الرسم، اعراب، صرفہ) کے زیر مطالعہ بحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغة کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغة میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کے مزید آسانے کے لیے نمبر کے بعد قوسین (برکیٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے مثلاً ۱:۵:۲ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطع میں بحث اللغة کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطع میں بحث الرسم۔ وھكذا۔

۲:۴۰:۲ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصْرٰى وَالصَّبِيْئِيْنَ مِّنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صٰلِحًا فَاهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۲۰

۲:۴۰:۱ اللغة

[اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا] "اِنَّ" حرف مشبہ بالفعل معنی "بے شک، یقیناً، تحقیق ہے" مزید چاہیں تو دیکھ لیجئے [۲:۴۰:۱]۔ "الَّذِيْنَ" اسم موصول معنی "وہ سب جو کہ" ہے۔ مزید وضاحت کے لیے چاہیں تو الفاتحہ: ۱، [۱:۶:۱] دیکھئے۔ "اٰمَنُوْا" کا مادہ "ا م ن" اور وزن "فعل" ہے۔ دراصل "اٰمَنُوْا" تھا۔ مہموز کے قاعدہ تخفیف کے تحت اس کا "ا ن ا ن ا" (۱-۱-آ) میں بدل گیا۔ یہ اس مادہ سے باب افعال

کے فعل ہنئی کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرور اور خود اس باب (افعال) سے فعل "آمن یومن" ایمان لانا، کے معنی واستعمال پر البقرہ ۳۰: [۲: ۳: ۱۱۱] میں بات ہو چکی ہے۔ اس عبارت کا فعلی ترجمہ بنتا ہے "بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے۔" لوگ میں "وہ سب" کا مفہوم موجود ہے۔ بعض نے "ایمان لاچکے ہیں" سے ترجمہ کیا ہے جو عمدہ رسالت کے حوالے سے ملحوظ زمانہ درست ہے۔ بعض نے "مسلمان ہوئے/ہیں" سے ترجمہ کیا ہے۔ "مسلمان" "مسلم" ہی کی بجز ہی ہوتی (اور فارسی ترکی اردو میں مستعمل صورت لفظ ہے۔ لغت اور اصطلاح میں "ایمان" اور "اسلام" دو الگ مفہوم رکھتے ہیں۔ تاہم عام مفہوم میں دونوں ہم معنی شمار ہوتے ہیں۔ بعض نے "الذین آمنوا" کا ترجمہ صرف "مسلمان" اور "ایمان والے" ہیں (بصورت جملہ اسمیہ) کیا ہے جو لفظ سے ہٹ کر ہے۔ اگرچہ ملحوظ مفہوم غلط نہیں ہے۔

۲: ۳۰: ۱۱۱ [۲: ۳۰: ۱۱۱] "والذین هادوا" "ذ" (اور) "الذین" (وہ لوگ جو کہ) ہے۔ یہاں "الذین" کی تکرار کی وجہ سے دوسرے "الذین" کے ترجمہ میں بھی "لانا بہتر ہے یعنی" وہ بھی جو کہ "اگرچہ اکثر مترجمین نے "الذین" کا یہی مادہ و ترجمہ لکھا ہے۔

"هادوا" کا مادہ "ه و د" اور وزن اصلی "فَعَلُوا" ہے۔ یہ دراصل "هَوَدُوا" تھا جس میں واو متحرک ماقبل مفتوح الف میں بدل کر لکھی بولی جاتی ہے (مثلاً قالوا) اس مادہ سے فعل مجرور "هَادِيَهُوْهُوْا" (باب نصر سے مثل قال يقول) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی "توبہ کرنا اور حق کی طرف مڑنا" ہیں۔ عموماً اس کے بعد "الی" کا صلا آتا ہے (جب یہ بتانا ہو کہ توبہ کے لیے کسی کی طرف مڑا، جیسا کہ "إِنَّمَا هَذَا إِلَيْكَ" (الاعراف: ۵۶) میں آیا ہے۔

● اس فعل کے دوسرے مشہور معنی "یہودی ہونا" ہیں۔ اس استعمال کے لیے کسی صلا کی ضرورت نہیں رہتی اور ان معنوں میں یہ فعل قرآن کریم میں دس جگہ استعمال ہوا ہے۔ اور اسی فعل کا مضارع "يهود" معروف باللام (اليهود) ہو کر معنی "جمع پوری یہودی امت یعنی یہودی مذہب (یہودیت) کے پیروکاروں کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ بھی قرآن مجید میں آٹھ دفعہ آیا ہے۔ اور ایک یہودی کو عربی میں یہودی کہتے ہیں (یہ لفظ بھی قرآن میں ایک دفعہ آیا ہے) اور اليهود یعنی جمع والے معنی (یہودیوں) کے لیے لفظ "هَوْد" بھی قرآن کریم میں تین بار استعمال ہوا ہے جو دراصل اس فعل مجرور ہادیہود سے اسم الفاعل "هَادٍ" (ہاؤد) کی جمع محسر ہے۔ اور "هَوْد" ایک پنیر کا نام بھی ہے یہ بھی قرآن کریم میں سات جگہ وارد ہوا ہے۔

● اور بعض کے نزدیک فعل ”ہاد“ دراصل عبرانی لفظ ہے تاہم اب یہ لفظ اور اس کے مشتقات (اسم فعل وغیرہ) اصل عربی کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔

اس طرح ”والذین ہادوا“ کا لفظی ترجمہ بنتا ہے ”اور وہ بھی جو یہودی ہوئے“ جسے بعض نے صرف ”یہودیوں“ یا ”یہودی“ بمعنی جمع ”مسلمان“ کی طرح ترجمہ کر دیا ہے جو لحاظ مفہوم درست ہے۔

۲: ۴۰: ۱ (۲) [وَالنَّصَارَى] کی ذرا تے عطف (یعنی ”اور“) ہے اور لفظ ”النَّصَارَى“ (برسم المائی) کا مادہ بظاہر ”ن ص ر“ اور وزن لام تعریف نکال کر فَعَالِیٰ بنتا ہے۔ جو عربی میں جمع مکسر کا ایک وزن ہے جیسے ”نَدَّامَان“ (پشیمان مرد/عورت) کی جمع ”نَدَّاجِیَا“ آتی ہے۔ اس طرح گویا ”نصاری“ کا واحد ”نَصْرَانُ“ (مذکر) یا ”نَصْرَانَةٌ“ (مؤنث) ہے۔ جس سے مراد حضرت عیسیٰؑ سے منسوب مذہب کا پیروکار (مرد یا عورت) ہے (جسے بار بار ہاں سچی یا عیسائی بھی کہتے ہیں) مگر عربی میں یہ لفظ ہمیشہ یا تے نسبت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی ”نصاری“ (مرد) اور ”نصرانۃ“ استعمال نہیں ہوتے۔

● دراصل اس لفظ (نصاری) کا عربی مادہ ”نصر“ سے کوئی لغوی تعلق نہیں ہے اس مادہ (نصر) اور عربی کے بعض اوزان سے اس کی مناسبت محض اتفاقی بات ہے۔ اس لیے دیکھتے ہیں کہ اسی مادہ کے تحت بیان ہوتے ہیں۔ اس لفظ (نصاری) کا واحد ”نصاری“ (بروزن اَعْرَافِ) ہے اور اس کی اصل ”المناصرة“ ہے جو فلسطین کے شمالی علاقہ ”جلیل“ میں ایک قصبے کا نام ہے (عربی لغتوں میں آپ کو یہی نام نظر آئے گا مگر انگریزی اُلموں میں اسے ”Nazareth“ لکھا جاتا ہے) حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کا بچپن اور ابتدائی عمر کا بیشتر حصہ اسی گاؤں میں گزرا تھا۔ اس لیے ان کے پیروکاروں کو ”نصاری“ کہا جانے لگا جسے انگریزی میں Nazarene کہتے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ کے لقب ”المسیح“ کی نسبت سے وہ مسیحی بھی کہلاتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں یہ لفظ (مسیح) کسی شکل میں استعمال نہیں ہوا۔ اگرچہ لقب ”المسیح“ متعدد (۱۱) جگہ آیا ہے۔ لفظ ”نصاری“ قرآن میں ۴ جگہ اور واحد منصوب کلمہ ”نصرانیاً“ صرف ایک جگہ آیا ہے۔

● نزول قرآن کے زمانے میں دین مسیح کے پیروکاروں کو اہل عرب ”نصاری“ ہی کہتے تھے بلکہ وہ خود بھی ”نصاری“ کہلاتے تھے جیسا کہ المائدہ: ۴۸ میں آیا ہے: ”قَالُوا يَا نَصَارَىٰ—مَسِيحُ كَالْفُطْرِ“ عرب دنیا میں بھی مغرب سے آنے والے لفظ ”کریستین“ (Christian) کے ترجمے کے طور پر رائج ہوا ہے۔ ”المسیح“ ”Christ“ کی عربی ہے اور عیسائی کا لفظ صرف برصغیر میں رائج ہوا ہے

یعنی صبح کے نام عیسیٰ کی نسبت سے یہی وجہ ہے کہ اردو میں نصاریٰ کا ترجمہ بعض نے سحی اور عیسائی سے کر دیا ہے کیونکہ برصغیر میں یہی معروف لفظ ہے۔

۲: ۴۰: ۱ (۳) [وَالصَّابِثِينَ] (یہ اس لفظ کا رسم اطلاق ہے اس کے رسم عثمانی پر آگے بحث "الرسم" میں بات ہوگی)۔ "واو عاطفہ" اور لام تعریف نکال کر لفظ "صابثین" نکلتا ہے جس کا مادہ ص ب ث اور وزن "فَاعِلِينَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرور "صَبَّأً يَصْبَأُ صَبْوَةً" (باب فتح سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں: باہر نکل آنا مثلاً کہتے ہیں "صَبَّأَ النِّجْمُ" (ستارہ طلوع ہوا) اور "صَبَّأَتِ الْبَعِيرُ" (اونٹ کا دانت کھلی۔ نکل آیا) پھر اس سے اس میں "ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف جانا" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اور پھر اسی سے یہ ایک مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں: "صَبَّأَ الرَّجُلُ" (آدمی نے اپنا مذہب بدل لیا) مکہ کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور مسلمان ہونے والے صحابہ کرام کے لیے یہی فعل استعمال کرتے تھے۔ "مسلمان ہونا" (اسلم یسلم) یا "ایمان والا" (امن یؤمن) کا فعل ان کے لیے کافر استعمال نہیں کرتے تھے۔ قرآن کریم میں اس مادہ ص ب ث کے کوئی فعل کہیں استعمال نہیں ہوا بلکہ اس سے مشتق صرف یہی لفظ "صابثین" (بصیغہ جمع الفاعل) معروف باللام شکل میں (مرفوع و منصوب) تین دفعہ آیا ہے۔

● "صابثون" (جس کا واحد فعل مجرور سے اسم الفاعل "صابی" ہے) اور جس کی جمع مکسر "صابثۃ" بھی آتی ہے (قرآن کریم میں صیغہ واحد اور جمع مکسر کہیں استعمال نہیں ہوا) ایک مذہب کے پیروکاروں کو بھی کہا جاتا تھا۔ چونکہ یہ لوگ اپنی مذہبی تعلیمات بہت کم ظاہر کرتے تھے اس لیے اس کی حقیقت کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ وہ شاید ستارہ پرست بھی تھے اور غالباً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام سے بھی نسبت رکھتے تھے۔ ان کے مذہب کے بارے میں اسی ابہام اور عدم معلومات کی بنا پر اہل عرب اور خصوصاً اہل مکہ لفظ "صابی" کو بے دین یا عجیب و غریب دین والا کے معنی میں لیتے تھے۔

● قرآن کریم میں صابثین کا ذکر تین جگہ آیا ہے جن میں سے دو جگہ (البقرہ: ۶۲ اور المائدہ: ۷۲) تو ان کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ گویا اپنی اصل کے لحاظ سے یہ بھی کبھی (اپنی اصلی شکل میں) ایک دین برحق تھا۔ اور یہ بھی کہ صابثین بھی اس زمانے میں یہود و نصاریٰ کی طرح ایک معروف امت تھے۔ تیسری جگہ (الحج: ۱۷) میں ان کا ذکر اہل عرب کے لیے معروف مذاہب عالم میں سے ایک مذہب کے طور پر ہوا ہے۔

● صاحبین کے مذہب کی حقیقت کے بارے میں مذکورہ بالا مقامات پر ہمارے مفسرین نے بھی کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ ان کے بارے میں اس قسم کی تفصیل ہمارے دائرہ کار سے خارج ہیں۔ تاہم اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے بعض حوالوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً شہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں ان کے بارے میں زیادہ لکھا ہے۔ ہمارے زمانے کی جدید کتابوں میں سے عباس محمود العقاد کی کتاب "ابراہیم - ابوالانبیاء" میں بھی ان کے بارے میں عمدہ معلومات ملتی ہیں۔ "قاموس القرآن (القرشی)" میں بعض قابل توجہ امور بیان ہوئے ہیں۔

● آج کل اس مذہب کے پیروکار "جو" صابئہ "اور" مندائیتین " (واحدہ مندائی) کہلاتے ہیں، ایران کے مغربی حصے میں اور جنوبی عراق کے مشرقی حصے میں یعنی دونوں ملکوں کے سرحدی علاقوں میں دریاؤں کے کنارے پائے جاتے ہیں۔ ان کی مذہبی رسومات میں بہتے دریا کا بڑا دخل ہے۔ ان کی کل آبادی پندرہ ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ ان کے بعض پڑھے لکھے لوگوں نے اپنے "صابئی" بچوں کے لیے دینی تعلیمات کے کتابچے بھی لکھے ہیں۔ عراق کے شہر بجلہ المورہ کے "علیہ السلام" کا ایک مقالہ اصحاب الروحانیات أو الصابئۃ المندائیون کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ان لوگوں کے مذہب، اس کی تاریخ، ان کے عقائد و اعمال اور ان کی مخصوص (علیحدہ) دینی زبان کے بارے میں بہت عمدہ معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں اور ان معلومات کے مصادر کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ فمن شاء فليبر ابعه۔

● ہمارے مترجمین میں سے بیشتر نے تو مصابئین، فرقہ صابئین، صابی لوگ سے ترجمہ کیا ہے۔ بعض نئے بے دین اور بعض نے "ستارہ پرست" سے ترجمہ کیا ہے۔ اس کی وجہ اور لغوی بحث میں بیان ہوتی ہے۔

[مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ] میں "من" موصولہ شرطیہ (یعنی "جو کوئی بھی") ہے، چاہیں تو مزید وضاحت [۱۱: ۷۱۲] میں دیکھ لیجئے۔ "آمن" کے مادہ "باب فعل اور معانی پر البقرہ ۳: [۱: ۲: ۱] (۱) میں بات ہو چکی ہے۔ "بِ" تو فعل "آمن" کا صمد ہے۔ اس طرح اس عبارت کا ترجمہ بنتا ہے "جو کوئی بھی ایمان لایا اللہ پر" مگر "مَنْ" کے شرطیہ ہونے کی وجہ سے فعل مستقبل میں بھی ترجمہ ہو سکتا ہے یعنی "ایمان لائے یا لائے گا" کی صورت میں۔

[وَالْيَوْمِ الْآخِرِ] اس پوری ترکیب (وَالْيَوْمِ + الْآخِرِ) کے کلمات پر البقرہ ۸: [۱: ۷۱۲] میں بات ہو چکی ہے ویسے "وَالْيَوْمِ" کے لیے الفاخروہ: ۵ [۱: ۴: ۱] اور البقرہ کے لیے الفاخروہ: ۴ [۱: ۳: ۱] اور البقرہ کے لیے البقرہ: ۴ [۱: ۳: ۲] کی طرف رجوع کر سکتے ہیں ترجمہ بنتا ہے "اور

آخری دن پر (ایمان لائے) جسے پچھلے دن، آخرت اور قیامت سے بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔ مفہوم سب کا ایک ہی بنتا ہے۔ تاہم بعض ترجمہ اصل الفاظ سے ہٹ کر ہے مثلاً "قیامت" سے ترجمہ کرنا۔

[وَعَمِلَ صَالِحًا] "و" عاطفہ ہے اور "عَمِلَ" کے مادہ وزن باب فعل اور معنی وغیرہ البقرہ: ۲۵

[۲: ۱۸: ۲۱] میں اور "صَالِحًا" کے مادہ وزن وغیرہ کی بحث البقرہ: ۱۱ [۲: ۱۸: ۲۱] میں نیز

البقرہ: ۲۵ [۲: ۱۸: ۲۱] میں دیکھئے۔ اس جملے کا ترجمہ بنتا ہے "اور اس نے کام کیا اچھا" جس کی بالحدودہ صورتیں "کام کیے نیک"، "اچھے کام کرتے رہے"، "اچھے کام کیے۔ نیک کام کرتے رہے"، "عمل نیک کرے گا۔ نیک عمل کرے" اختیار کی گئی ہیں بصیغہ جمع ترجمہ کرنے کی وجہ "مَنْ" ہے جو لفظاً واحد مگر لحاظ معنی جمع ہے۔ اور کہیں ماضی کہیں مستقبل یا مضارع سے ترجمہ کی وجہ "مَنْ" میں شرط کا مفہوم یا اصل متعل فعل (ماضی) کا لحاظ ہے۔

[فَلَهُمْ] جو "فَتْ" (پس، تو پھر)، "لِ" (کے لئے)، "هَمْ" (ان) کا مرکب ہے یہ تمام کلمات کسی دفعہ گزر چکے ہیں۔ ترجمہ ہے "پس ان کے لیے ہے" جسے بعض نے معنی شرط کے جواب دینے کی بنا پر چھوڑ کر "اور بعض نے" "هَمْ" کا ترجمہ بھی اسی جواب شرط والے مفہوم کی بنا پر "ایسوں کے لیے"، "ایسے لوگوں کو" سے کیا ہے یعنی "جن کی صفات اوپر بیان ہوئی ہیں وہ لوگ" اور "لَهُمْ" کا ترجمہ "ان کو"، "ان کا" بھی ہو سکتا ہے۔

[۲: ۴۰: ۴] [أَجْرُهُمْ] میں آخری ضمیر مجرور "هَمْ" بمعنی "ان کا" کی ہے اور کلمہ "أَجْرُ" کا

(جو یہاں بوجہ اضافت خفیف آیا ہے) کا مادہ "ا ج ر" اور وزن "فَعْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرور زیادہ تر باب نصر سے اور کبھی ضرب سے (أَجْرًا أَوْ أَجْرًا) آتا ہے اور اس کے متعدد معنی ہوتے ہیں: مثلاً

① "اجریا بدلہ یا ثواب دینا" کہتے ہیں: "أَجْرَهُ اللَّهُ" (علی ما فعل) یعنی اللہ نے اس کو اجر (ثواب) دیا (اس پر جو اس نے کیا)،

② "کرایہ پر دینا اور کرایہ پر لینا" مثلاً کہتے ہیں: "أَجَرَ الدَّارَ فَلَنَا" ای "آکدہ" یعنی اس نے فلاں کو گھر کرایہ پر دیا" اور "أَجَرَ الدَّارَ مِنْ فَلَانٍ" ای "اِکْتَوٰہ" یعنی "اس نے فلاں سے گھر کرایہ پر لیا" اور اسی معنی کے لیے یہ فعل باب افعال سے بھی آتا ہے یعنی "أَجَرَ الدَّارَ إِيجَارًا" اس نے گھر کرایہ پر لیا

③ "مکس کے لیے اجرت پر کام کرنا" مثلاً کہتے ہیں: "أَجَرَ الْعَامِلُ صَاحِبَ الْعَمَلِ" یعنی مزدور

(عامل) نے کام والے (صاحبِ فعل) کا کام اجرت پر کرنا منظور کر لیا یعنی وہ اس کا "اجیر" بن گیا۔ اور اسی معنی کے لیے بابِ مفاعله سے فعل "أَجْرُوْا اِجْرًا مَوْجُوْةً" (اجرت پر رکھنا۔ اجیر بنالینا) بھی استعمال ہوتا ہے اور بابِ افعال سے "أَجْرُوْا اِجْرًا مِجَارًا" (اجرت پر کام کرنا یا اجیر بننا) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا معانی کے علاوہ یہ فعل مجرور بعض دیگر معانی مثلاً بڑی کا غلط چڑھنا یا جوڑنا وغیرہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

● تاہم قرآن کریم میں اس فعل مجرور سے صرف ایک ہی صیغہ فعل "تَأْجُرُوْا" (تو صرف ایک جگہ (القصص: ۲۷) آیا ہے اور وہ بھی مذکورہ بالا صرف تیسرے معنی (۳) یعنی "کسی کے لیے اجرت پر کام کرنا" کے لیے ہی استعمال ہوا ہے۔ مزید فیہ میں سے صرف بابِ استفعال کے دو صیغے قرآن کریم (القصص: ۲۶) میں آئے ہیں۔ ان تین صیغوں کے علاوہ اس مادہ سے قرآن میں کوئی اور فعل استعمال نہیں ہوا۔

یہ مادہ "أَجْرُوْا" اس فعل مجرور کا مصدر (معنی "اجرت دینا") بھی ہے اور معنی کم المفعول (جو چیز بطور اجریا اجرت دی جائے) بھی استعمال ہوتا ہے جو "اجر" سے وہ "آجرت" ہے اور جس کو اجر دیا جائے وہ "مأجور" کہلاتا ہے اور جو چیز بطور اجرت دی جائے اسے "مأجور بہ" کہتے ہیں اسی لیے عربی میں کہتے ہیں "أَجْرُوْا بِكَذَا" (اس نے اسے فلاں شے اجریا دی) اور لفظ "اجر" (مأجور بہ) ہونے کے لحاظ سے متعدد معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً ثواب، اجر (یہ دونوں لفظ اردو میں بھی مستعمل ہیں) اور زیادہ تر "نیک عمل کی جزا، نیکی کا پھل، نیک کام کا اجر" کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں لفظ "اجر" ان معنی کے علاوہ مطلقاً اجرت، عوض، (عورت کا حق) مہر اور حق کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ بعض اہل لغت (مثلاً صاحب القاموس) نے "ثواب" اور "اجر" میں یہ باریک فرق بیان کیا ہے کہ "ثواب" صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے جب کہ "اجر" بندوں کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے گویا ہر "ثواب" اجر ہے مگر ہر اجر ثواب نہیں ہوتا۔

لفظ "اجر" (واحد جمع مفرد مرکب مختلف صورتوں میں) قرآن کریم کے اندر ۵۰ جگہ آیا ہے۔ زیر مطالعہ عبارت میں اس کا موزوں ترجمہ "ثواب" مزدوری، حق الخدمت، اجر اور صلہ کی صورت میں ہو سکتا ہے اور کیا گیا ہے۔

[عِنْدَ رَبِّهِمْ] جو "عِنْدَ" (ظرف بمعنی کے پاس، کے ہاں) + "رَبِّ" (رب پروردگار) +